زاہدہ زیدی*

مرزا غالب کی شعریات

دنیا کے اکثر بڑے شاعروں اور دوسرے فنکاروں کی طرح مرزا غالب نے بھی اپنے تخلیقی تجربے اور نظریۂ شعر پر کئی جگہ اظہار خیال کیا ہے۔ ان کا یہ نثری بیان کہ ''شاعری قافیہ پیمائی نہیں، معنی آفرینی ہے'' تو کافی مشہور ہوا۔ اور نہ صرف غالب تنقید میں بلکہ شاعری کی افہام وتفہیم اور محاکمے میں بھی اکثر اس کا حوالہ دیا جاتا رہا ہے اور حالیہ برسوں میں ان کا یہ شعر:

گنجینۂ معنی کا طلسم اس کو سمجھئے
جو لفظ کہ غالب مرے اشعار میں آوے

بھی توجہ کا مرکز رہا ہے اور اس کی روشنی میں غالب کے اشعار کی کثیر الجہت معنویت اور خاص طور سے نسخۂ حمیدیہ کی کسی قدر نامانوس اور پیچیدہ غزلوں کی تہ در تہ معنویت کی پرتیں کھولنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اور اسی طرح کچھ نایاب جواہر پارے جو عام قاری کی نظروں سے اوجھل تھے ہمارے ہاتھ آئے ہیں لیکن راقم کی محدود واقفیت کے مطابق مجموعی طور پر غالب کے چیدہ اشعار اور نثری بیانات کی روشنی میں ان کے نظریۂ شعر کا ایک خاکہ مرتب کرنے کی کوشش غالباً اب تک نہیں کی گئی ہے۔ یہ مضمون غالب کے چیدہ الفاظ کی مدد سے ان کے نظریۂ شاعری کا خاکہ مرتب کرنے کی ایک بالکل ابتدائی کوشش ہے۔ اور اس اعتبار سے نامکمل بھی کہ اس میں غالب کے ان نثری بیانات سے بھی استفادہ نہیں کیا گیا ہے جو ان کے فلسفۂ شعر پر مزید روشنی ڈالتے ہیں۔

اور اب اگر ہم مذکورہ شعر پر اپنی توجہ مرکوز کریں تو اس میں گنجینۂ معنی اور طلسم کے الفاظ خاص طور سے متوجہ کرتے ہیں۔ ان کی کارکردگی پر کسی قدر تفصیل سے تو آخر میں روشنی ڈالی جائے گی لیکن یہاں بھی اس بات کی طرف اشارہ کرنا ضروری ہے کہ غالب کے جن اشعار کی مدد سے ہم ان کے تخلیقی موقف اور فلسفۂ شعر پر روشنی ڈال رہے ہیں ان کی معنویت کے اور بھی کئی پہلو ہیں جن کا محاکمہ اس مقالے کی حدود میں ممکن نہیں۔

اور اب سب سے پہلے یہ بظاہر سادہ شعر ملاحظہ کیجئے:

*پروفیسر، ایچ-آئی-جی فلیٹ، سرسید نگر، علی گڑھ-۲۰۲۰۰۱

Scanned by CamScanner

ہے رنگ لالہ وگل ونسریں جدا جدا　　　ہر رنگ میں بہار کا اثبات چاہیئے

اور یہاں ہم یہ محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکتے کہ غالب کے لیے مظاہر کائنات کا حسن، دلکشی اور رنگارنگی صرف ایک موضوع سخن ہی نہیں بلکہ ان کی شاعری کا بنیادی Inspiration یا تخلیقی تحریک بھی ہے اور ''بہار کا اثبات'' زندگی کی دلکشی، دلربائی اور برنائی کو کھلے دل سے قبول کرنے اور اپنی تخلیقی فکر میں جذب کرنے کا استعارہ ہے۔ اور اب یہ شعر:

بخشے ہے جلوۂ گل ذوق تماشا غالب
چشم کو چاہیے ہر رنگ میں وا ہو جانا

اور یہاں بھی ''جلوۂ گل'' زندگی کا حسن، رنگینی اور بوقلمونی ہی ہے۔ جو شاعر کے تخلیقی وفور کا سرچشمہ ہے۔ البتہ یہاں ''ذوق تماشا'' کی ترکیب خاص طور سے جاذب توجہ ہے جس میں حیرت، مسرت، اقربت اور فاصلے کے عناصر یکجا ہو گئے ہیں اور ''چشم کا وا ہو جانا'' تخلیقی بصیرت کی کارکردگی کا استعارہ ہے۔ اور یہ خصوصیات غالب کے بہترین اشعار میں ہر جگہ دیکھی جا سکتی ہیں جہاں گردو پیش کی دنیا اور جذبات کی یلغار میں ایک پر جوش شرکت کے ساتھ ساتھ ان سے ایک فاصلہ قائم رکھنے اور معروضیت کا انداز بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ جس کے باعث اکثر موقعوں پر ایک لطیف طنز نے غالب کی شاعری کو دو آتشہ بنا دیا ہے۔ حیرت، مسرت، انبساط، جوش، قربت اور فاصلہ یوں بھی ایک بھرپور تخلیقی تجربے کے اہم اجزائے ترکیبی ہیں۔ اور اب اس شعر پر بھی توجہ ضروری ہے:

وہی اک بات ہے جو یاں نفس واں نکہت گل ہے
چمن کا جلوہ باعث ہے مری رنگیں نوائی کا

یہاں نہ صرف ''رنگیں نوائی'' کی ترکیب میں شعری تخلیق کی طرف ایک واضح اشارہ ہے جس کا سرچشمہ ''چمن کا جلوہ'' یعنی زندگی کا حسن اور رنگینی ہی ہے بلکہ اس شعر میں نفس انسانی اور مظاہر فطرت بلکہ کائنات میں جو نامیاتی تعلق ہے اس کی طرف بھی ایک اہم اشارہ ہے۔ اور یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ اس وحدت اور گہرے باہمی تعلق کا احساس ہی بڑی شاعری کو جنم دیتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں شاعرانہ تخیل یا تخلیقی فکر گردو پیش کی دنیا اور ذاتی کوائف کے ساتھ ساتھ ایک کائناتی وژن کو بھی اپنے اندر سمو لینے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ جیسا کہ اس شعر میں کس قدر واضح انداز میں کہا گیا ہے؛

قطرہ میں دجلہ دکھائی نہ دے اور جزو میں کل
کھیل لڑکوں کا ہوا دیدۂ بینا نہ ہوا

یہاں شاعری کے منصب کی ایک زیادہ ہمہ گیر اور واضح تعریف ہمارے سامنے آتی ہے۔ یعنی شاعر صرف ''جلوۂ گل'' اور زندگی کے حسن اور رنگینی ہی کا اسیر نہیں بلکہ اس کا ''دیدۂ بینا'' یا تخلیقی بصیرت قطرے میں

Scanned by CamScanner

دریا اور ذرے میں صحرا کا جلوہ بھی دیکھتی ہے۔ گویا شاعری بصارت سے بصیرت اور ذاتی تجربے سے کائناتی وژن (Vision) تک کا سفر ہے۔ اور اسی خیال کا ایک زیادہ لطیف اظہار اس شعر میں ہوا ہے:

محرم نہیں ہے تو ہی نوا ہائے راز کا
یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا

یہ شعر ایک طرف تو وحدۃ الوجود کے فلسفے کا ایک شاعرانہ اظہار ہے اور دوسری طرف اس خیال کا کہ شاعری کا منصب مظاہرِ کائنات میں ایک باطنی وحدت اور گہری معنویت کا انکشاف ہے۔ اس شعر میں محرم اور حجاب، حجاب اور پردہ، پردہ اور ساز، ساز اور نوا، پردہ اور راز اور محرم اور راز کی پہلو بہ پہلو موجودگی اور اس کا مخصوص آہنگ جس نے ان سب عناصر کو شعریت میں ڈھال دیا ہے اسے گنجینۂ معنی کا طلسم بنائے ہوئے ہے۔

جیسا کہ مندرجہ بالا اشعار سے بھی ظاہر ہے، غالب کی شعریات میں دیکھنے کا عمل یا آنکھ کی کارکردگی ایک کلیدی اہمیت کی حامل ہے جس کی مدد سے انہوں نے مختلف سیاق وسباق میں معنویت کی کئی پرتیں کھولی ہیں۔ مثلاً یہ شعر:

ظاہر کی آنکھ سے نہ تماشا کرے کوئی
ہو دیکھنا تو دیدۂ دل وا کرے کوئی

یعنی شعری تخلیق میں دیکھنے کا عمل مظاہر کائنات تک محدود نہیں بلکہ اس کے لیے ''دیدۂ دل'' یا باطنی احساس بھی ایک لازمی شرط ہے۔ اور یہاں ہمیں مرزا غالب انگلش کے عظیم شاعر ولیم ورڈز ورتھ کے تخلیقی عمل یا شاعرانہ تخیل کے تصور سے بہت قریب نظر آتے ہیں جس کا اظہار ورڈز ورتھ نے اپنی معروف نظم Tintern Ebbey میں ایک جگہ اور اپنی شاہکار نظم The Prelude میں زیادہ تفصیل سے اور بار بار کیا ہے اور اسی شعر کے پہلو بہ پہلو یہ شعر بھی قابلِ توجہ ہے:

جب تک دہانِ زخم نہ پیدا کرے کوئی
مشکل کہ اس سے روئے سخن وا کرے کوئی

یہ شعر ایک طرف تو عشقیہ جذبے کا اظہار ہے اور دوسری طرف شاعری کے ایک اور پہلو کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ یعنی کسی گہری بصیرت یا معنویت تک رسائی حاصل کرنے کے لیے اگر ایک طرف دیدۂ دل ایک لازمی شرط ہے تو دوسری طرف ''دہانِ زخم'' بھی اسی قدر ضروری۔ یعنی عظیم شاعری شدتِ احساس اور غم کی فراوانی کے بغیر ممکن نہیں اور اس خیال کا اظہار اس شعر میں زیادہ دلکش اور منفرد انداز سے ہوا ہے:

جوئے خوں آنکھوں سے بہنے دو کہ ہے شامِ فراق
میں یہ سمجھوں گا کہ شمعیں دو فروزاں ہو گئیں

یہ شعر بھی گہرے درد وغم کا اظہار ہے جہاں شاعر یا عاشق کی گریہ وزاری ایک جوئے خوں میں تبدیل ہو گئی

Scanned by CamScanner

ہے، لیکن شام فراق کی اس المناک تاریکی میں اس جوئے خوں کا دو فروزاں شمعوں میں تبدیل ہو جانا راقم کی رائے میں ذاتی غم کا روشن شعری پیکروں اور تابناک بصیرت میں منقلب ہو جانے کا استعارہ ہے۔ اس لیے یہ شعر بھی غالب کی شعریات کی ایک اہم کڑی ہے۔

لیکن یہ بات بھی قابل غور ہے کہ غالب کی شعریات میں شدت احساس اور غم کی فراوانی کے ساتھ ساتھ فکر کی توانائی اور خیال کی سربلندی بھی اسی قدر اہم ہیں۔ اس لیے وہ اکثر اس جوئے خوں میں بہہ جانے کے بجائے اپنی شکست دل کا تماشائی بن جانا زیادہ پسند کرتے ہیں۔ مثلاً یہ شعر:

مدعا محو تماشائے شکست دل ہے
آئینہ خانے میں کوئی لئے جاتا ہے مجھے

یہاں ''تماشا'' اور ''آئینہ خانہ'' خاص طور سے قابل غور ہیں۔ ''تماشا'' میں لطف مسرت کے ساتھ فاصلے کا تصور بھی موجود ہے اور آئینہ خانے نے شکست دل کی کرچیوں کو ہزاروں دل پذیر تصویروں یعنی شعری پیکروں میں تبدیل کر دیا ہے۔ اور فکر و تعقل کی یہ بالا دستی اور ذاتی غم سے فاصلہ قائم کرنے کا انداز بھی غالب کی شعریات کا ایک اہم پہلو ہے۔ اور کبھی کبھی تو فکر کی شدت اور اندیشہ ہائے دور و دراز کی حدت اس قدر بڑھ جاتی ہے کہ دل کا آبگینہ بھی پگھلتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔

ہاتھ دھو دل سے یہی گرمی گر اندیشے میں ہے
آبگینہ تندیٔ صہبا سے پگھلا جائے ہے

اور

ہجوم فکر سے دل مثل موج لرزے ہے
کہ شیشہ نازک و صہبا ہے آبگینہ گداز

اور یہ شدت فکر، تعقل کی بالا دستی اور اندیشہ ہائے دور و دراز کی کارفرمائی بھی کچھ ایسی خصوصیات ہیں جو باطنی احساس اور غم کی فراوانی کے ساتھ ساتھ غالب کی شاعری میں جاری و ساری ہیں۔ اس لیے ان کی شعریات میں بھی ان کا عمل دخل لازمی تھا۔ اور اب اس شعر پر بھی نظر ڈالنا ضروری ہے جو غم اور شاعری کے تعلق کو ایک انوکھے انداز میں پیش کرتا ہے:

میں چمن میں کیا گیا، گویا دبستاں کھل گیا
بلبلیں سن کر مرے نالے غزلخواں ہو گئیں

اس شعر کی تشریح عام طور پر اس طرح کی گئی ہے کہ کوئی نالہ یا آواز سن کر بلبلوں کا ایک ساتھ چہکنا مدرسے میں بچوں کے ایک ساتھ با آواز بلند سبق یاد کرنے سے مشابہ ہے۔ اس لیے شاعر کے نالہ کناں باغ میں جانے سے ایک دبستان کھل جاتا ہے۔ یہ تشریح اپنی جگہ ٹھیک ہے۔ لیکن اس طرح یہ شعر صرف ایک واقعے

Scanned by CamScanner

کا دلچسپ بیان ہے اور اس کی کوئی اور معنویت نہیں۔ دوسرے اس بات کی وضاحت بھی نہیں ہوتی کہ غالب نے بلبلوں کے لیے غزل خواں ہونے کا خیال کیوں باندھا ہے جبکہ عام طور پر تو غالب نے بلبل کو نالہ کناں اور شاعر کو نغمہ سرا بتایا ہے۔ مثلاً یہ اشعار:

کہتا ہے کون نالۂ بلبل کو بے اثر
پردے میں گل کے لاکھ جگر چاک ہو گئے

اور

چمن کا جلوہ باعث ہے مری رنگیں نوائی کا

لیکن اس شعر میں غالب نے شاعر کو نالہ کناں اور بلبلوں کو غزل خواں بتایا ہے۔ اس لیے راقم کی رائے میں یہاں ''میں'' توغم واندوہ میں ڈوبا ہوا ایک عاشق یا عام انسان ہے۔ اور بلبلوں کا غزل خواں ہو جانا اس غم و الم کا شعری اظہار میں ڈھل جانے کا استعارہ ہے۔ گویا ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ کے خیال کے مطابق یہاں غالب نے The man who suffers اور The mind that creates میں حد فاصل قائم کی ہے۔ اور یہ خیال غالب کی شاعری کے عام تصور سے بھی قریب تر ہے۔ کیونکہ ہم یہ محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکتے کہ ان کی شاعری میں ہر جذبہ اور ذاتی غم، تقلیب، تزئین اور ترفع کے مراحل سے گزر کر ہی شعر کے سانچے میں ڈھلتا ہے۔ اسی طرح ایک اور شعر:

ہوں گرمیٔ نشاطِ تصور سے نغمہ سنج
میں عندلیبِ گلشنِ ناآفریدہ ہوں

اس شعر کی تشریح سردار جعفری اور کچھ دوسرے نقادوں نے اس طرح کی ہے کہ غالب ایک مٹتی ہوئی تہذیب کے نوحہ خواں ہی نہ تھے بلکہ خوش آئند تبدیلیوں اور ایک بہتر مستقبل کے نقیب بھی تھے۔ لیکن راقم کی رائے میں اس شعر کی معنویت زیادہ وسیع ہے اور اس کا سیاق تاریخی نہیں بلکہ نظریاتی ہے۔ ارسطو نے شاعری کی تعریف اس طرح کی ہے کہ یہ زندگی کی نقالی یا عکاسی ہے۔ لیکن ساتھ ہی اس بات کی وضاحت بھی کر دی ہے کہ یہ تاریخ سے بمراحل دور، زیادہ ہمہ گیر اور فلسفیانہ نوعیت کا بیان ہے۔ کیونکہ شاعر زندگی کی عکاسی صرف اس طرح نہیں کرتا جیسی کہ وہ ہے یا تھی۔ بلکہ اس طرح کرتا ہے کہ جیسی کہ وہ ہو سکتی ہے یا جیسا اسے ہونا چاہیئے تھا۔ اور ظاہر ہے کہ اس طرح کی پیش کش میں شاعر کا تصور یا تخیل ہی اس کا رہنما، ہمنوا اور ہمراز ہوتا ہے۔ اور یہاں بھی شاعر ''گرمیٔ نشاطِ تصور'' سے ''نغمہ سنج'' ہے۔ اور خود کو عندلیبِ گلشنِ ناآفریدہ بتاتا ہے۔ یعنی شاعر اپنے تخیل کی مدد سے ایک ایسی دنیا تخلیق کرتا ہے جو حقیقی نہ ہوتے ہوئے بھی اپنی جگہ مکمل، نشاط آگیں اور معنی خیز ہوتی ہے اور اکثر حقیقی دنیا کے کسی مخفی پہلو کو بے نقاب بھی کرتی ہے یا پھر Jon Keats (جون کیٹس) کے الفاظ میں:

Scanned by CamScanner

"What the imagination seizes as Beauty must

be truth whether it existed before or not"

اس طرح راقم کی رائے میں یہاں شاعر کا گرمیٔ نشاط تصور' سے نغمہ سنج ہونا انگریزی حکومت کی سماجی اصلاحات کی مدح سرائی یا ایک شاندار مستقبل کی نوید نہیں بلکہ شاعری کے اعلیٰ ترین منصب کا خوبصورت بیان ہے۔

لیکن اس دنیا میں جو شاعر کے تصور کی زائیدہ اور اس کے تخیل کا شاہکار ہے صرف نشاط آگیں نغمہ سرائی ہی کافی نہیں بلکہ مستانہ روی بھی ایک لازمی شرط ہے اس لیے غالب کہتے ہیں:

مستانہ طے کروں ہوں رہ وادیٔ خیال
تا بازگشت سے نہ رہے مدعا مجھے

یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ یہ وادیٔ خیال شاعری ہی کی قلمرو ہے اور یہ مستانہ روی، تخلیقی وفور اور سرعت خیال کا استعارہ ہے یعنی یہاں نہ صرف چشم و گوش کی دنیا بلکہ نشاط تصور کی دنیا سے بھی آگے بڑھ کر مستانہ روی کی ضرورت پیش آتی ہے اور پھر اس کے بعد تو الہامی کیفیت ہی شاعر کی رہنما ہوتی ہے، چنانچہ غالب اس بات کا بھی اعتراف کرتے ہیں:

آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں
غالب صریر خامہ نوائے سروش ہے

اور یہ نوائے سروش ظاہر ہے کہ الہامی تجربے ہی کا استعارہ ہے۔ عبدالرحمان بجنوری نے تو دیوان غالب کو ایک سرتاسر الہامی کتاب قرار دیا تھا۔ ہمارا ان کی رائے سے پورے طور پر اتفاق کرنا تو ضروری نہیں لیکن اس بات کا اعتراف لازمی ہے کہ غالب کی شاعری میں لاشعوری دھاروں کی رفتار، تخلیقی وفور اور الہامی عناصر کی جلوہ فرمائی عام شاعروں سے کہیں زیادہ ہے۔ اس لیے الہامی کیفیت کی فراوانی کو بھی غالب کی شعریات کا ایک اہم جز و تصور کیا جا سکتا ہے۔

اور اب ہم غالب کی شعریات کے اس مختصر محاکے کو اور زیادہ سمیٹتے ہوئے کہہ سکتے ہیں کہ زندگی اور مظاہر کائنات سے ایک پُر جوش اور بھرپور تعلق اور اس کی دلربائی، برنائی اور السنا کی کا احساس، مسرت، حیرت، ذوق تماشا اور احساس حسن، دیدہ بینا اور باطنی احساس، قطرے میں دریا اور ذرے میں صحرا کا جلوہ دیکھنے کی صلاحیت، شدت احساس اور فکر کی توانائی، غم کو بصیرت اور نالے کو نغمے میں منقلب کرنے کا شعور۔ اسرار کائنات کی نقاب کشائی کا جنون اور اندیشہ ہائے دور و دراز کی کارفرمائی، تصور اور تخیل کی ایک مکمل اور نشاط آگیں کائنات کی تخلیق، بصارت کو بصیرت میں ڈھالنے کا جذبہ اور تہ در تہ معنویت کی طلسم کاری، معنی آفرینی، بلند پروازی اور مستانہ روی اور الہامی کیفیت کے وسیلے سے حقیقت کا براہ راست انکشاف غالب کی شعریات کے اجزائے ترکیبی

Scanned by CamScanner

ہیں۔اور ہمیں یہ کہنے میں تامل نہیں کہ یہ ہر زمانے میں عظیم شاعری کے اجزائے ترکیبی بھی رہے ہیں۔
لیکن یہاں اس بات کی وضاحت بھی ضروری ہے کہ غالب ایک عظیم آفاقی شاعر ضرور ہیں لیکن وہ ایک خاص تاریخی سیاق وسباق میں بھی اپنا وجود رکھتے ہیں۔اور اس لیے اپنے زمانے کی شعری روایت سے بھی ان کا تعلق ناگزیر ہے۔جس کے شعری رویوں اور فنی لوازمات کو انہوں نے بڑی حد تک قبول کیا جس کا عکس ان کے ان اشعار میں بھی دیکھا جا سکتا ہے۔

مقصد ہو ناز وغمزہ ولے گفتگو میں کام
چلتا نہیں ہے دشنہ و خنجر کہے بغیر
ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو
بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

اور غالب نے اس شعری روایت اور خاص طور سے غزل کی روایت کے دائرے میں رہ کر ہی اپنی لا ثانی تخلیقی صلاحیتوں کے جوہر دکھائے۔اور اپنے مختصر دیوان میں عظیم شاعری کے جواہر پارے بکھیر دیے۔ انہوں نے اس مجبوری کو جس کا اظہار ان اشعار میں ہوا ہے ایک بے پناہ تخلیقی وفور اور اس کی محدودیت کو غیر معمولی وسعت اور ثروت میں تبدیل کر دیا۔ یہاں اس بات کی وضاحت بھی ضروری ہے کہ جب غالب نے کہا تھا کہ شاعری قافیہ پیائی نہیں معنی آفرینی ہے تو انہوں نے نثری شاعری کی وکالت نہیں کی تھی اور نہ ان کا ارادہ قافیہ، ردیف اوزان اور بحور کی شاعری کو ترک کرنے کا تھا۔ان کا مطلب تو صرف یہ تھا کہ شاعری محض قافیہ پیائی نہیں بلکہ اس کا بنیادی جوہر اس کی معنی آفرینی ہے۔

اور اس طرح اسی روایت کے دائرے میں رہ کر غالب نے نادر اور معنی خیز استعاروں، خوبصورت تشبیہوں، اظہاریت سے بھرپور علامتوں، بصیرت افروز تلمیحات اور ہوشربا پیکر تراشی کی ایک ایسی باثروت اور معنی خیز دنیا تخلیق کی جس کی مثال اردو شاعری بلکہ عالمی شاعری میں بھی مشکل سے ملے گی۔اور اس طرح انہوں نے اپنی شاعری کو صحیح معنوں میں گنجینۂ معنی کا طلسم بنا دیا اور یہ جواہر پارے غالب کی شاعری میں ہر جگہ بکھرے ہوئے ہیں۔ یہاں میں صرف چند مانوس مثالوں پر اکتفا کروں گی جن کی ہمہ جہت معنی آفرینی تشریح کی زحمت سے بے نیاز ہے:

بسکہ ہوں غالب اسیری میں بھی آتش زیر پا
موئے آتش دیدہ ہے حلقہ مری زنجیر کا

ہر قدم دوری منزل ہے نمایاں مجھ سے
میری رفتار سے بھاگے ہے بیاباں مجھ سے

Scanned by CamScanner

لوگوں کو ہے خورشید جہاں تاب کا دھوکہ
ہر روز دکھاتا ہوں میں اک داغ نہاں اور

ہے کہاں تمنا کا دوسرا قدم یارب
ہم نے دشت امکاں کو ایک نقش پا پایا

دام ہر موج میں ہے حلقۂ صد کام نہنگ
دیکھیں کیا گزرے ہے قطرے پہ گہر ہونے تک

چشم خوباں خامشی میں بھی نوا پرداز ہے
سرمہ تو کہوے کہ دودِ شعلۂ آواز ہے

دیکھو تو دلفریبی انداز نقش پا
موج خرام ناز بھی کیا گل کتر گئی

کہتا ہے کون نالۂ بلبل کو بے اثر
پردے میں گل کے لاکھ جگر چاک ہو گئے

جوئے خوں آنکھوں سے بہنے دو کہ ہے شام فراق
میں یہ سمجھوں گا کہ شمعیں دو فروزاں ہو گئیں

غنچہ پھر لگا کھلنے آج ہم نے اپنا دل
خوں کیا ہوا دیکھا، گم کیا ہوا پایا

دیدار بادہ، حوصلہ ساقی، نگاہ مست
بزم خیال میکدۂ بے خروش ہے

دل ہر قطرہ ہے ساز اناالبحر
ہم اس کے ہیں ہمارا پوچھنا کیا

اور جب ہم ان اشعار کو غالب کی شعریات کی روشنی میں پڑھتے ہیں تو ان کا لطف اور معنویت دوچند ہو جاتی ہے۔

☆☆☆

Scanned by CamScanner

فکرونظر

سہ ماہی

دسمبر ۲۰۰۷ء

جلد: ۴۴

شمارہ: ۴

مدیر

پروفیسر آزرمی دخت صفوی

۱۔شبلی روڈ،علی گڑھ مسلم یونیورسٹی،علی گڑھ

rekhta

Scanned by CamScanner

Scanned by CamScanner